Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

TITLE OF THE PAPER

Decolonization: Introduction and Understanding

رڈِاستعماریت: تعارف و تفہیم

AUTHOR(s)

Muhammad Shahzad Anjum
PhD Scholar, Department of Urdu and Eastern Languages
Govt. College University, Faisalabad

Dr Sumaira Akbar (Correspondence Author)
Assistant Prof, Department of Urdu and Eastern Languages
Govt. College University, Faisalabad

ABSTRACT

This research article presents a comprehensive study of decolonization (Red-e-Iste'marit) as a critical, ideological, and literary discourse that challenges colonial legacies and neo-colonial dynamics. The narrative of human civilization has historically been defined by power struggles, conquest, and exploitation. During the classical era, imperial expansion relied primarily on brute military force. However, the European Renaissance and the subsequent imperial era transformed mechanisms of control by weaving intellectual, linguistic, and cultural justifications into the apparatus of dominance. Postcolonialism emerged as a vital intellectual and literary movement aimed at dismantling the mental, institutional, and cultural frameworks left by colonial rulers. Drawing upon the foundational theories of Frantz Fanon, Aimé Césaire, Antonio Gramsci's concept of hegemony, and Edward Said's critique of Orientalism, this paper highlights how imperial powers maintained control through local elites, Eurocentric educational curricula, and narrative domination. Ultimately, this article emphasizes that genuine liberation requires challenging Western epistemological dominance, reclaiming native linguistic and cultural identities, and critically deconstructing the disguised forms of contemporary imperial control.

KEY WORDS

Postcolonialism, Neo-colonialism, Hegemony, Urdu Literature, Decolonization, Edward Said, Frantz Fanon, Nasir Abbas Nayyar.

JOURNAL PROFILE

Noor-e-Tahqeeq is a quarterly, HEC "Y" Category research journal of Lahore Garrison University, publishing peer-reviewed studies in Urdu language and literature since 2017. It provides a credible platform for original research and contemporary criticism.

CONTACT

Dr Muhammad Haroon Qadir
Editor, Noor e Tahqeeq
Department of Urdu
Lahore Garrison University, Lahore 0303-3330345

Email

lgunt@lgu.edu.pk

Website

https://ojs.lgu.edu.pk/nooretahqeeq

ISSUE DETAILS

Volume 10, No 02
April to June 2026
Page No: - 93-102

DOI

https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2026.100248

HISTORY OF THE PAPER

Received on: April 10, 2026
Accepted on: May 30, 2026
Published on: June 30, 2026

PUBLISHED BY

Department of Urdu,
Lahore Garrison University
DHA Phase 6, Sector C,
Avenue 4, Lahore

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ردِّ استعماریت: تعارف و تفہیم

تاریخ کرہ ارض پر انسانی تاریخ کتنی پرانی ہے اس کا کوئی حتمی جواب دینا شاید ممکن نہ ہو مگر یہ بات بلاخوفِ تردید کی جاسکتی ہے کہ تمدن انسانی کے ارتقا کی داستان خیر و شر، ظالم و مظلوم اور شکاری و شکار کی باہمی کشمکش سے عبارت ہے۔ جنگ و جدل، ہوس اور ملک گیری تاریخ انسانی کے ہر دور کی کہانی ہے۔ قدیم زمانے کے طاقتور حکمران اپنی طاقت کے نشے میں چور ہو کر کمزور اقوام پر لشکر کشی کرتے تھے اور اپنے مفتوحہ علاقوں کے عوام کے جان، مال، عزت، آبرو اور وسائل پر اپنا قبضہ جماتے تھے تو اپنے اس فعل کے لیے انہیں کوئی توجیہہ یا جواز پیش کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوتی تھی کیونکہ یہی زمانے کا چلن تھا۔ یہ بادشاہت اور ملوکیت کا دور تھا جب فاتح اپنے کسی بھی غیر انسانی عمل کے لیے کسی کے سامنے جوابدہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔

سکندرِ اعظم نے دنیا فتح کی تو بڑے اعتماد کے ساتھ خود کو دیوتا کا درجہ دے دیا۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے خون کی ندیاں بہائیں تو مقتولین کی کھوپڑیوں کے مینار تعمیر کیے تاکہ تاریخ میں اُن کی بربریت کی سند رہے۔ پھر تاریخ کی ایک کروٹ کے ساتھ جب یورپ کی نشاۃِ ثانیہ شروع ہوئی تو اسے علم، شعور اور تہذیب کا دور کہا گیا۔ اس دور میں فاتحین کی فطرت تو نہ بدلی مگر ملک گیری کے انداز ضرور بدل گئے۔ اس دور میں فاتحین کا طریقہ کار یہ رہا کہ اپنے ظالم، بربریت، لوٹ کھسوٹ اور ناجائز تسلط کی توجیہہ ضرور پیش کر دی گئی۔ اپنے ہر ظالمانہ عمل اور فعل کی ضرورت سے دنیا کو آگاہ کر دیا گیا۔

جب دنیا بھر میں استعماری تسلط اپنے عروج پر تھا اور محکوم اقوام کے اندر مزاحمتی شعور جنم لے رہا تھا تو یہ مزاحمت ابتدا میں زیادہ تر عملی اور سیاسی نوعیت کی تھی یعنی آزادی کی تحریکیں، مقامی قیادت کا اُبھار اور استعماری قوتوں کے خلاف براہِ راست جدوجہد۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد بڑی تعداد میں جب ایشیائی اور افریقی ممالک نے سیاسی آزادی حاصل کی تو اس دور میں ان اقوام میں یہ احساس بیدار ہوا کہ محض سیاسی آزادی کافی نہیں کیونکہ استعمار نے مقامی معاشروں کی زبان، تعلیم، تاریخ نویسی اور ثقافتی شناخت پر بھی گہرے اثرات مرتب کیے تھے جس کے برعکس ردِ استعماریت ایک وسیع تر فکری تحریک کی شکل اختیار کرنے لگی، جس کا مقصد محض استعمار کے خاتمے کا جشن منانا نہیں تھا بلکہ اس کے پیچھے چھوڑے گئے ذہنی، تہذیبی اور ادارہ جاتی اثرات کا تنقیدی جائزہ لینا تھا۔ اُسی دور میں یہ سوچ مضبوط ہوئی کہ نو آبادیاتی معاشروں کی تاریخ کو صرف تاریخ اقوام کے زاویے سے نہیں بلکہ خود محکوم اقوام کے تجربے اور نقطہ نظر سے بھی لکھا جانا چاہیے۔

ردِ استعماریت دراصل اس تاریخی عمل کے خلاف ایک فکری، ادبی اور نظریاتی ردِ عمل ہے جو استعماری سلسلے سے جنم لیتا ہے۔ مصریوں اور یونانیوں سے شروع ہونے والا یہ سفر جب عثمانی، روسی اور آسٹرین سلطنتوں سے ہوتا ہوا بیسویں صدی کے امریکا، برطانیہ، اٹلی،

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

فرانس اور جاپان تک پہنچا تو اس نے صرف زمینوں پر قبضہ نہیں کیا بلکہ مقامی تہذیبوں، زبانوں، علمی روایات اور شناختوں کو بھی زیرِ نگیں کیا۔ اس حوالے سے ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقم طراز ہیں:

”۱۸۰۰ء میں یورپی طاقتوں نے زمین کے ۵۵ فیصد حصے پر قبضے کا دعویٰ کیا جو حقیقتاً ۳۰ فیصد تھا۔ ۱۸۷۸ء تک پوری انسانی آبادی کا ۶۷ فیصد یورپی ممالک کے قبضے میں چلا گیا اور ۱۹۴۱ء تک ۲۰۴۰۰۰ مربع میل کے رقبے پر مغربی ممالک کے پرچم لہرا رہے تھے جو کل زمین کا ۸۵ فیصد تھا۔“(1)

نو آبادیات کا بنیادی مقصد وسائل پر قبضہ تھا۔ بیسویں صدی تک یہ قبضے براہ راست ہو رہے تھے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد بالواسطہ وسائل پر تصرف کا تصور در آیا۔ جسے نو استعماریت بھی کہتے ہیں جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہوا کہ اس طریقہ کار میں مقامی آبادیوں میں سے ہی اشرافیہ کو استعماری مقاصد کی تکمیل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے یوں یہ اشرافیہ مختلف صورتوں میں داخلی استعمار کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ استعمار کے حربوں کو پہچاننا اور ان کے خلاف بیانیہ تشکیل دینے کے عمل کو ردِ استعمار کہا جاتا ہے۔ محمد عامر سہیل کے بقول:

”رد استعماریت کے لیے استعمار شکن، ترکِ نو آبادیات، استعمار شکست، ردِ نو آبادیات اور سامراج شکن ایسے نام استعمال کیے جاتے ہیں۔ نو آبادیاتی نظام اور نو سامراجیت کے جملہ استعماری بیانیوں سے انحراف اور روگردانی ردِ استعماریت ہے۔ ترکِ نو آبادیات کے لیے ضروری ہے کہ نو آبادیاتی باشندے باقیات نو آبادیات سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اپنی تہذیبی اقدار اور ثقافتی شعار سے رجوع کریں۔ ذاتی و جسمانی غلامی سے نجات حقیقی استعمار شکن رویہ ہے۔“(۲)

ادبی، سیاسی اور فکری اصطلاح میں ردِ استعماریت سے مراد وہ ہمہ گیر فکری اور عملی جدوجہد ہے جو نو آبادیاتی طاقتوں کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ان کے قائم کردہ ذہنی، لسانی، ثقافتی اور معاشی اثرات کو شعوری طور پر مسترد کرنے کے لیے کی جاتی ہے۔ اصطلاحاً یہ مغرب کے اس بیانیے کی نفی ہے جس کے تحت مشرق کو جاہل، پسماندہ اور اسیر اوہام قرار دے کر مغرب کی ذہنی اور سیاسی غلامی کو ناگزیر بتایا گیا تھا۔ اردو ادب میں یہ اصطلاح استعمار کے پیدا کردہ فکری تعصبات کو بے نقاب کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

ردِ استعماریت بنیادی طور پر غیر ملکی سامراجی یا نو آبادیاتی راج کے خلاف سیاسی، عسکری، نظریاتی اور ثقافتی مزاحمت کا نام ہے۔ یہ صرف کسی بیرونی طاقت کو ملک سے نکالنے کا نام نہیں ہے، بلکہ نو آبادیاتی طاقتوں کے قائم کردہ سیاسی ڈھانچوں، معاشی استحصال اور ان کے مسلط کردہ ذہنی و ثقافتی اثرات سے مکمل نجات حاصل کرنے کا ایک ہمہ گیر عمل ہے۔ بیسویں صدی میں یہ ایک طاقتور تاریخی واقعے کے طور پر ابھرا جس کے نتیجے میں دنیا بھر میں آزادی کی تحریکیں چلیں اور پاکستان، بھارت سمیت افریقہ اور لاطینی امریکہ کے درجنوں ممالک آزاد ہوئے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

نظریاتی اور فلسفیانہ سطح پر ردِ استعماریت نے مغرب کے اس جھوٹے دعوے کو چیلنج کیا کہ وہ پسماندہ قوموں کو تہذیب یافتہ بنانے آیا ہے۔ ردِ استعماری مفکرین نے واضح کیا کہ استعمار دراصل طاقتور ممالک کی طرف سے کمزور قوموں کے وسائل کی لوٹ مار اور ان کی شناخت کو مسخ کرنے کا ایک پر تشدد حربہ ہے۔ یہ فلسفہ انسان کو یاد دلاتا ہے کہ سیاسی آزادی کے بعد بھی اگر کوئی قوم ذہنی طور پر اپنے پرانے آقاوں کی زبان، کلچر اور نظام کو برتر سمجھتی رہے تو وہ حقیقی معنوں میں آزاد نہیں ہو پاتی۔

ادبی اور فکری تاریخ میں ردِ استعمار کا شعور محض ایک حادثاتی رد عمل نہیں، بلکہ ایک منظم علمی جہاد ہے۔ اس سچے فکری انقلاب کی بنیاد ایمی سیزر اور فرانز فینن جیسے بیدار مغز دانشوروں نے اپنے خونِ جگر سے رکھی۔ یہ وہی ابتدائی چنگاریاں تھیں جنہیں آگے چل کر ایڈورڈ سعید نے ایک باقاعدہ آفاقی نظریے کی شکل دی اور نو آبادیاتی نظام کے ان تمام مخفی چہروں، حربوں اور علمی مغالطوں کو بے نقاب کیا جن کے ذریعے محکوم قوموں کو صدیوں تک فکری اسارت میں رکھا گیا۔

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ مغرب نے دنیا کو مسخر کرنے کے لیے جتنی بھی مہم جوئیاں کیں، جتنے بھی استعماری قوانین وضع کیے، اور غاصب وزارتوں کو یادداشتوں کے جو پلندے بھیجے ان سب میں انسانی اقدار کا دور دور تک کوئی نشان نہ تھا۔ وہ صرف مادی ہوس اور حاکمیت کا ایک ننگا رقص تھا جس پر تہذیب کا جھوٹا غازہ ملا گیا تھا۔

ایمی سیزر نے اس تلخ حقیقت سے پردہ اٹھایا کہ نو آبادیاتی نظام صرف بندوق کے زور پر قائم نہیں ہوا، بلکہ اس کی اخلاقی اور فکری عمارت کھڑی کرنے میں مغرب کے نام نہاد فلاسفروں، ادیبوں اور دانشوروں نے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ علم کو مغلوب قوموں کے خلاف ہتھیار بنایا گیا۔ فرانسیسی فلاسفر ارنسٹ رینان جیسے لوگ یہ مضحکہ خیز فلسفہ تراشتے رہے کہ کم تر اور سیاہ فام اقوام کا اعلیٰ نسلوں کے ہاتھوں مغلوب ہو جانا کوئی ظلم نہیں بلکہ عین مشیتِ ایزدی اور قدرت کا فیصلہ ہے۔ ان کے نزدیک مغرب کا ہر فرد پیدائشی طور پر اعلیٰ نسب کا مالک ہے، جس کا مقدر چھوٹے موٹے اوزاروں سے مزدوری کرنا نہیں بلکہ ہاتھ میں تلوار تھام کر دنیا پر راج کرنا اور مہم جوئی کی تھکن اتارنے کے لیے غصب شدہ جاگیروں میں عیش و عشرت کی زندگی گزارنا ہے۔

استعمار نے ہمیشہ اپنی لوٹ مار کو انسانی فلاح کا مقدس نام دیا۔ جیسے ہند چینی کے سابق گورنر جنرل البرٹ اسٹورٹ نے وہاں کے طلبہ کو سرزنش کرتے ہوئے یہ درس دیا کہ یورپی نو آبادکاروں پر قبضے کا الزام لگانا ایک شرمناک گمراہی ہے۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اگر یورپی مہم جو ان خطوں میں نہ پہنچتے، تو ان پسماندہ زمینوں کے بے پناہ وسائل یونہی نااہل اور غافل ہاتھوں میں ضائع ہو جاتے۔ الجزائر کی تحریکِ آزادی کے ممتاز دانشور فرانٹز فینن نے نو آبادیاتی نظام کے نفسیاتی اور جسمانی تشدد کا عمدہ تجزیہ پیش کیا ہے۔ اپنی شاہکار کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

> "Colonialism is not a thinking machine, nor is it a body endowed with reason. It is violence in its natural state, and it will only yield when confronted with greater violence."(3)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

یہ وہ پروپیگنڈا تھا جس نے سامراجی پالیسیوں کو عوام میں قابل قبول بنانے کو دانشورانہ اور فکری سطح پر جواز فراہم کیا۔ یورپی مفکرین نے اپنے ممالک کی قبضہ گیری کو نہ صرف ایک تہذیبی مشن کے طور پر پیش کیا بلکہ اس فکر کو ادبی پیرائے میں ڈال کر نصاب کا حصہ بھی بنایا گیا تاکہ اسے عوامی پذیرائی حاصل ہو اور بیرون ملک جاکر دوسرے علاقوں پہ قبضہ کر کے وہاں کے وسائل کی لوٹ مار کرنے والوں کو مقامی آبادی اپنے نجات دہندہ کے طور پر دیکھے۔ اس مسلسل پروپیگنڈے کے اثرات عام آدمی تک بھی آئے اور مقامی آبادی خود کو کمزور، ناتواں، بے بس اور اپنے اوپر قبضے کو مشیت ایزدی سمجھنے لگی۔ یہ وہ فکری اجارہ داری ہے جو بنا کوئی ہتھیار چلائے لوگوں کو ذہنی طور پر مفتوح کر لیتی ہے۔ سامراج کا اولین قبضہ بزور طاقت ہے لیکن اس کے بعد اسے اپنے غلبے کو برقرار رکھنے کے لیے مقامی آبادی کی جو حمایت درکار ہوتی ہے یا اس کی مزاحمتی اور مدافعتی قوت کو ختم کرتا ہوتا ہے۔ اس کے لیے فکری اجارہ داری سے ہی کام لیا جاتا ہے۔ اردو میں مابعد نو آبادیات اور ردِ استعمار مطالعات میں اہم حصہ ڈالنے والے ڈاکٹر ناصر عباس نیر لکھتے ہیں:

> ”اجارہ داری کسی نظریے، تصور اور اقتدار کا ایسا غلبہ ہے جس میں تشدد نہ ہو۔ استعماریت طاقت کے متشددانہ اور بہیمانہ استعمال میں کوئی قباحت نہیں دیکھتی مگر وہاں جہاں فوری سیاسی اور عسکری اہداف کا تعاقب مقصود ہو (مثلاً ۱۸۵۷ء) کی جنگ آزادی کے دوران میں اور افریقا میں عام طور پر لیکن جب دیرپا ثقافتی اہداف کا حصول پیش نظر ہو تو اجارہ داری کی حکمت عملی سے کام لیا جاتا ہے۔“(4)

ڈاکٹر ناصر عباس نیر ہی ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

> ”نو آبادیاتی نظام صرف زمینوں پر قبضہ نہیں کرتا، وہ مقامی زبانوں کو حاشیے پر ڈال کر آقا کی زبان کو اقتدار، علم اور تہذیب کی علامت بنا دیتا ہے۔ ردِ استعماریت کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنے لسانی اور ثقافتی نظام پر اصرار کریں اور مغرب کے مسلط کردہ معیارِ علم کو چیلنج کریں۔“(5)

ردِ استعمار کی یہ ادبی بحث معروف مارکسی دانشور انتونیو گرامچی کے تصورِ اجارہ داری سے جا ملتی ہے، جنھوں نے فاشسٹ مسولینی کی قیدِ تنہائی کے دوران یہ نظریہ وضع کیا کہ سامراجی طاقتیں صرف بندوق اور پولیس کے اندھے استعمال سے نہیں بلکہ محکوم قوم کی رضامندی اور ذہنی تسلیمِ خم کے ذریعے اپنا تسلط برقرار رکھتی ہیں۔ نو آبادیاتی حکمرانوں نے اسی حربے کے تحت تعلیمی اداروں اور اپنے مخصوص نظامِ علم کو نافذ کیا جس نے نصاب، شعر اور ادب کے ذریعے برصغیر جیسے خطوں میں یہ سفید جھوٹ رائج کر دیا کہ یورپ ہی تہذیب و سائنس کا واحد مرکز ہے جبکہ مقامی معاشرہ محض توہمات کا ملغوبہ ہے۔ علم کے اس غلبے اور یورپ کو ترقی کا آخری ماڈل بنا کر پیش کرنے کے مکارانہ عمل نے مقامی روایتوں کو پسماندہ کر کے مٹا دیا؛ چنانچہ ادبی ردِ استعمار کا اصل ہدف گرامچی کے اسی فکری تسلط کو توڑنا ہے جس نے عام ذہنوں کو اپنی ہی مٹی اور تاریخ سے بیگانہ کر کے غاصب کی برتری کو ایک حتمی سچ ماننے پر مجبور کر دیا تھا۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

اس کا نقصان یہ ہوا کہ سامراج کا غلبہ تو ہوا ہی مگر ساتھ ہی مقامی تہذیب، ثقافت، روایت اور ادب سب پس پشت چلے گئے۔ ان میں جتنی عوام دانش اور عوام دوستی تھی، وہ سب بھلا دی گئیں۔ لوک دانش، لوگ ادب اور لوک روایت کو بھلا دیا گیا یا اسے کم تر خیال کیا گیا۔ یہ استعمار کا وہ حربہ تھا جس نے اس کے اقتصادی غلبے سے بھی کہیں زیادہ نقصان پہنچایا۔ اس لیے کہ اس کے نتیجے میں مقامیت ختم ہو کر رہ گئی۔ مقامی آدمی اپنی جڑوں سے کٹ گیا جس سے اس پر ہر قسم کا غلبہ پانا آسان ہو گیا۔ حنا جمشید لکھتی ہیں:

> "استعمار بنیادی طور پر تو استعمار کا ہی جن ہے مگر اسے کھل کھیلنے کے لیے مقامی ثقافت پر اپنی برتری کا زعم پیدا کرنا پڑتا ہے۔ مقامی ثقافت اپنے اندر کتنی ہی خوبیوں رکھتی ہوں، تو آباد کار یا استعمار اسے مقامی آبادی کی طرح کم حیثیت اور حقیر ثابت کرنے کے حربے استعمال کرتا ہے۔"(6)

ایک وقت تک یہ سامراجی قوتیں خود کو نہایت کامیابی کے ساتھ نجات دہندہ کے طور پر پیش کرتی رہیں۔ مغربی طاقتوں نے جب ایشیاء افریقا کے ملکوں میں اپنی نو آبادیات قائم کیں تو ان کے لیے استعماریت ایک تہذیبی مشن تھا کہ جس کے ذریعے وہ ان اقوام کو مہذب بنانا چاہتے تھے۔ اس لیے ابتدائی دور میں استعماریت کو مثبت طور پر لیا جاتا تھا اور اخلاقی طور پر اسے ایک ایسا عمل سمجھا جاتا تھا کہ جو انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے ہے لہٰذا ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کی دہائیوں میں یورپ میں لبرل اور سوشلسٹ بھی اس کی حمایت کرتے تھے۔ اس کے مفہوم میں اس وقت تبدیلی آئی جب نو آبادیات میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو ان سیاسی تحریکوں نے استعماریت اور اس کے استحصال کے خلاف احتجاج کیا۔ ۱۹۴۰ء کی دہائی میں اس کے خلاف ردعمل شدید طور پر ابھر کر آیا مگر بدقسمتی سے آزادی کے بعد تو آزاد ملکوں کے ہاں جو سیاسی بدعنوانیاں ہوئیں، ان کے حکمرانوں نے جس انداز میں اپنے عوام کا استحصال کیا، فوجی آمریتوں اور مطلق العنان حکومتوں نے جمہوریت کو روکے رکھا، ان عوامل کی وجہ سے استعماریت ایک بار پھر جارحانہ انداز میں واپس آ گیا اور اپنے روشن پہلوؤں کو اجاگر کرنے لگا۔ ڈاکٹر مبارک علی کے بقول:

> "استعماریت اور اس کے دفاع کرنے والوں نے اپنی کالونیل تحریک کو غیر اہم اور رجعت پسند ثابت کرنے کے سلسلہ میں دلائل کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ کچھ نفسیات دانوں نے اپنی امپیریل ازم کے پس منظر میں نو آبادیات کے لوگوں کی ذہنی بیماری اور نفسیاتی الجھنوں کی نشان دہی کی۔ ان کے استدلال کے مطابق ذہنی انتشار اور بے چینی کی اہم وجہ یہ تھی کہ مغربی جدیدیت نے انھیں مقامی اقدار اور روحانیت سے محروم کر دیا تھا اور اسے گھٹا کر مارجعل فرد میں بدل دیا۔ جو نہ تو مغربی تہذیب کا رہا اور نہ مقامی، بلکہ اس کلماش میں اس کی شخصیت مسخ ہو گئی۔ رو عمل کے طور پر وہ اینٹی کالونیل ہو گیا۔ اس کا یہ جذبہ ایک نفسیاتی جذبہ ہے، سیاسی نہیں۔ اس کے ذریعے وہ اپنی مسخ شدہ شکل کو بہتر بنانا چاہتا ہے۔"(7)

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

ڈاکٹر مبارک علی سامراج کے طریقہ کار کی وضاحت کرتے ہوئے یورپی سامراج کو بطور مثال پیش کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ سامراجی حکومت کسی بھی ملک پر تین طریقوں سے حکومت کرتی ہے۔ پہلا فوجی طاقت اور قوت کے ذریعے۔ دوسرا طریقہ لوگوں کو ذہنی طور پر غلام بناتا ہوتا ہے۔ اس کے لیے نصابی کتب اور تعلیم کو استعمال کیا جاتا ہے۔ سامراج کی تیسری حکمت عملی یہ ہے کہ مقامی لوگوں کا تعاون حاصل کیا جائے۔ یہ مقامی لوگ نہ صرف فوج میں تھے بلکہ پولیس، مخبری کے ادارے اور انتظامیہ میں بھی نچلے عہدوں پر فائز تھے۔ ان کے ذریعے معاشرے کو قابو میں رکھا جاتا تھا۔ ہندوستان کے نوابوں، راجاؤں اور جاگیر داروں کو تسلط میں رکھنے کے لیے بہت سی مشکل روایات کو اختیار کیا گیا۔ یعنی درباروں کا انعقاد کرنا اور ہندوستان کی اشرافیہ کو خطابات دیتا اور دربار میں ان کے مرتبے کے لحاظ سے ان کو نشستیں الاٹ کرنا۔ اس حکمت عملی کی بنیاد پر وہ ہندوستان کے مغربی تعلیم یافتہ طبقے اور ریاست کے حکمرانوں کو قابو میں رکھتے تھے۔ اسی دربار سے وابستہ شاعر و ادیب پھر انہی کے قصیدے گاتے اور انہیں عوام کا خیر خواہ ثابت کرتے۔

مشرق وسطیٰ اور برصغیر کے تناظر میں استعماری تاریخ کو مسترد کرنے کے حوالے سے محمد حسن عسکری کا فکری کردار بنیادی ہے۔ ان کے خیالات کا نچوڑ کچھ یوں ملتا ہے:

> "مغرب نے ہمیں تاریخ کا جو سبق پڑھایا ہے، وہ یہ ہے کہ ہماری اپنی کوئی تاریخ یا علمی روایت نہیں تھی۔ ردِ استعماریت کا مقصد مغرب کے اس تسلط کو توڑنا ہے اور اپنی تاریخ کو اپنی آنکھ سے دیکھنا ہے، نہ کہ فاتح کی عینک سے۔"(8)

استعمار اور اس کے حواری دانشوروں کے ان مکارانہ فکری حربوں کا پردہ چاک کرنا ہی حقیقی معنوں میں ردِ استعماریت کہلاتا ہے جس کا آغاز ایمی سیزئر اور فرانز فینن جیسے انقلابی مفکرین نے نو آبادیاتی پروپیگنڈے کے خلاف پہلی بار تھیوری کی سطح پر علمی مزاحمت کی ترویج سے کیا۔ اسی فکری تسلسل کو فلسطینی الاصل دانشور ایڈورڈ سعید نے اپنے گراں قدر اضافوں سے کمالِ فن تک پہنچایا، جنہوں نے جدید استعماری حربوں کے لیے نو استعماریت کی اصطلاح وضع کی اور بالادست اور زیر دست کے نفسیاتی جدلیات کو بے نقاب کیا۔ ایڈورڈ سعید کے مطابق بالادستی جب حاکم کی نفسیات میں رچ بس جاتی ہے تو وہ ہر معاملے میں خود کو برتر سمجھنے لگتا ہے جبکہ محکوم مسلسل مغلوب رہنے کے باعث احساسِ کمتری کو اپنی خصلت بنالیتا ہے ایک ایسا رویہ جس کی ترویج میں انیسویں صدی کے لکھاریوں نے بھی نادانستہ یا دانستہ کردار ادا کیا۔ ایڈورڈ سعید نے گوروارڈ نروال (Gerard de Nerval) اور گستاو فلابیئر (Gustave Flaubert) جیسے ادیبوں کی مثالوں سے واضح کیا کہ سامراجیت پر تشویش کا شکار ہونے یا اس میں ملوث ہونے کے باہمی اختلاف کے باوجود دونوں نے اپنے فکشن میں مشرق کو ایک مخصوص، جامد اور الگ تھلگ ساخت میں ملفوف کر کے بالکل اسی طرح پیش کیا جیسے کوئی نو آبادکار اپنی سلطنت کے مرکز میں بیٹھ کر محکوم دنیا کی تقدیر کا فیصلہ کرتا ہے چنانچہ ادبی ردِ استعمار کا اصل مقصد متن کی تہوں میں چھپے اسی استعماری شعور کو برہنہ کرنا ہے۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

نو آبادیاتی جبر کا سب سے المناک پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں فرد اپنی حقیقی انفرادیت اور آزاد وجود سے یکسر محروم ہو کر محض ایک مغلوب موضوع بن جاتا ہے جس کی داخلی دنیا کو اس مکارانہ انداز میں تشکیل دیا جاتا ہے کہ وہ اطاعت پذیری کو مجبوری کے بجائے ایک اخلاقی قدر اور استعماری مرکز کے لیے جان و مال کی قربانی کو اعلیٰ ترین نصب العین سمجھنے لگتا ہے۔ ردِ استعماری تناظر میں ایرک فرام کے استبدادی ضمیر کے حوالے سے یہ فکری نکتہ عیاں ہوتا ہے کہ محکوم فرد غاصب کی سیاسی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی ثقافتی علامتوں زبان، ادب، لباس اور آداب کو کمال اور عظمت کا واحد معیار تسلیم کر لیتا ہے جہاں کسی دوسری تہذیب سے شعوری استفادے اور اس غاصب تہذیب کو اپنا مقتدر ضمیر بنا لینے کا فرق مٹ جاتا ہے۔ ادبی ردِ استعمار کا اصل مقصد جدید فرد اور اس نو آبادیاتی کٹھ پتلی کے درمیان دھندلاتی ہوئی سرحد کو واضح کرنا ہے تاکہ محکوم فرد استعمار کے تراشیدہ جمالیاتی و ثقافتی بتوں کو پاش پاش کر کے اپنے مسخ شدہ داخلی ضمیر اور آزاد انسانی وجود کو دوبارہ دریافت کر سکے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ نو آبادیات جہاں جہاں ختم ہوئیں یا کمزور ہوئیں وہاں عوام کو مکمل آزادی نصیب نہیں ہو سکی کیونکہ ان کی اکثریت استعمار زدہ ہو چکی تھی اور استعمار کے مقامی نمائندے اب اس کی خدمت کے لیے مستعد تھے۔ محمد عامر سہیل کے مطابق:

> ''نو آبادیاتی نظام جب ختم ہوا تو وہ تمام اثرات جو نو آبادیاتی نظام کی بدولت مقامی باشندوں پر وارد ہوئے تھے، وہ ختم نہ ہوئے۔ بظاہر نو آبادیاتی ممالک آزاد ہو گئے لیکن ثقافتی و ذہنی آزادی حاصل نہ کر سکے۔ کالونیل ڈھانچہ قائم ہے۔ جدید نو آبادیاتی نظام میں سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ جمہوریت کے ذریعے غریب عوام (سابقہ مقامی باشندے استعمار زدہ) کو سامراجی مقاصد و مفاد کے تابع رکھا جاتا ہے۔ آج بھی سابقہ نو آبادیاتی ممالک اسی پستی، پسماندگی اور کمزوری کا شکار ہیں جیسے نو آبادیاتی عہد میں تھے یعنی صارفی حیثیت برقرار ہے۔''(9)

ردِ استعمار کے اس جدید اور تاریک تر فکری تناظر میں یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتی ہے کہ نو آبادیاتی آقاؤں کے براہِ راست مادی قبضے کے خاتمے کے بعد بھی مغلوب معاشروں کو محض ایک لایعنی صارفی منڈی بنا کر رکھا گیا جس نے مقامی انسان سے اس کا تہذیبی وقار چھین کر اسے ابدی زیر دست کی نفسیاتی پستی میں دھکیل دیا۔ جدید نو استعمار کا المیہ یہ ہے کہ سامراجی طاقتوں نے بظاہر رخصت ہوتے وقت ایک ایسی آلہ کار، ذہنی غلام اور بدعنوان مقامی اشرافیہ کو اقتدار سونپا جو اپنے ہی عوام کا خون چوستی رہی تاکہ دنیا کے سامنے یہ مکارانہ جواز پیش کیا جا سکے کہ یہ پسماندہ اقوام اپنی خود مختاری سنبھالنے کے اہل ہی نہیں ہیں۔ 1980ء کے بعد عالمی امپیریل ازم نے دفاعی پوزیشن چھوڑ کر ایک شدید جارحانہ رخ اختیار کر لیا تیسری دنیا کے ممالک میں جنم لینے والے سیاسی عدم استحکام، معاشی بدحالی، آمرانہ جبر، جہالت اور لاقانونیت کو مغرب نے اپنے پرانے گناہوں کی ندامت دھونے کے بجائے ایک نئے اخلاقی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا اور یہ جھوٹا بیانیہ گھڑا کہ یہ تمام سماجی برائیاں نو آبادیاتی نظم و ضبط اور یورپی تسلط کے اٹھ جانے کے باعث پیدا ہوئیں۔ آج امریکی استعمار کی صورت

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

میں سامراج بغیر کسی پشیمانی کے، ایک بار پھر تہذیبی و اخلاقی حسن اور انسانی حقوق کی بحالی کے دلفریب لبادے میں تیسری دنیا پر اپنے خونی پنجے گاڑ رہا ہے جہاں وہ اپنے مادی مفادات کی تکمیل کے لیے مقامی کٹھ پتلی حکمرانوں کے گٹھ جوڑ سے ہر انسانی قدر کو پامال کر دیتا ہے۔ ادبی ردِ استعمار مغرب کے اسی وحشیانہ تضاد اور اس کے اندر چھپے بہیمانہ پن کا پردہ چاک کرتا ہے جو ایک طرف تو مفتوحہ قوموں کو دانستہ طور پر غیر انسان بنا کر ان پر ظلم و استبداد کا بازار گرم کرتا ہے تو دوسری طرف خود غاصب معاشرے کے اندر بھی اخلاقی دیوالیہ پن اور درندگی کو اس حد تک راسخ کر دیتا ہے کہ وہاں کے حکمران طبقے خود اپنے ہی لوگوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرنے سے نہیں چوکتے۔ قدیم اصطلاحات کی روشنی میں جب جدید سیاسی اصطلاحات کا جائزہ لیا گیا تو استعمار اور ردِ استعمار کو یوں بیان کیا گیا:

> ”استعمار کا اصطلاحی مفہوم بدل چکا ہے۔ اب ردِ استعماریت سے مراد وہ تحریک ہے جو سامراجی طاقتوں کے سیاسی انخلا کے بعد بھی جاری رہتی ہے، کیونکہ استعمار جاتے جاتے اپنے قوانین، اپنی بیوروکریسی اور اپنا تعلیمی نظام یہیں چھوڑ جاتا ہے۔ ان پوشیدہ استعماری اثرات کو مسترد کرنا ہی اصطلاحی معنوں میں حقیقی ردِ استعماریت ہے۔“(10)

بیسویں صدی کے وسط میں ابھرنے والے اور جدیدیت، ساختیات و پسِ ساختیات کے فکری مابعد سے جڑنے والے پسِ نو آبادیاتی مطالعات کا اصل ادبی و علمی مقصد ان معاشروں کی تاریخ، ثقافت، زبان اور اجتماعی نفسیات کا وہ جراحی تجزیہ کرنا ہے جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ نو آبادیاتی نظام کے کلامیے نے مقامی انسان کو کس حد تک مسحور و مفتوح کیا اور اس کے خلاف کہاں کہاں حسی یا حرکی مزاحمت جنم لی۔ ردِ استعمار کے یہ ماہرین اس حقیقت کو آشکار کرتے ہیں کہ نو آبادیت اور پسِ نو آبادیت محض دو جداگانہ تاریخی ادوار کا نام نہیں، کیونکہ سیاسی آزادی کے واہمے کے باوجود پرانے استعماری مراکز نے اب خود کو نئی نو آبادیات کے ایک زیادہ مہلک، بالواسطہ اور جارحانہ روپ میں ڈھال لیا ہے۔ آج کا سامراج ویت نام، مشرقِ وسطیٰ اور افغانستان جیسی براہِ راست عسکری مداخلتوں کے علاوہ، عالمی بینک، آئی ایم ایف اور کثیر القومی کارپوریشنوں کے معاشی شکنجے اور باہمی اعتماد کے خوش کن معاہدوں کے ذریعے تیسری دنیا کا بدترین استحصال کر رہا ہے جہاں جدید ابلاغیاتی نظام، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا جیسے ہولناک ہتھیاروں سے ایک ایسا عالمگیر کلامیہ تشکیل دیا جا رہا ہے جو نئے انسان کے ذہن اور وجود کو مسخر کر کے اس کے اندر سے جذبہ مزاحمت کو ہی یکسر ختم کر دیتا ہے۔ معاصر ردِ استعماری ادب کا سب سے بڑا تخلیقی و تنقیدی چیلنج میڈیا اور صارفیت کے انہی مخفی، مکارانہ اور سحر انگیز متون کے طلسم کو توڑنا اور ذہنوں کو اس نئی اسارت سے بچانا ہے۔

آج واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے کہ دنیا کے کئی ممالک میں استعماریت تو ہے مگر نو آبادیت نہیں۔ آج عالمی استعمار نے بالخصوص تیسری دنیا میں ہر جگہ اپنے پنجے گاڑ رکھے ہیں جبکہ بظاہر نو آبادیات کو ترک کیا جا چکا ہے۔ کہنے کو یہ ممالک آزاد ہیں، ریاستیں آزاد ہیں لیکن ان کے سیاسی و معاشی نظام کو بیرونی استعمار اپنے اندرونی و مقامی استعماری سہولت کاروں کے ذریعے کنٹرول کرتا ہے۔ یہ اندرونی اور مقامی استعماری قوتیں اشرافیہ کی مختلف صورتوں میں بیرونی استعمار کے مفادات کو یقینی بناتی ہیں اور عوام پہ ظلم و جبر کا بازار گرم کیے رکھتی ہیں۔

Research Journal
Noor e Tahqeeq
ISSN (P) 2519-6618, ISSN (E) 2521-0157
Lahore Garrison University, Lahore

عوام کو مختلف مسائل میں الجھا کر انتشار کی کیفیت پیدا کیے رکھتی ہیں تا کہ عوام کسی صورت متحد نہ ہوں اور ان کے استعماری کردار سے متعلق نہ سوچ سکیں نہ سوال اٹھا سکیں۔ یہ استعماریت ہی کی ایک طرز ہے۔

اردو ادب میں ان مباحث کا آغاز ابھی ایک دہائی قبل ہی ہوا۔ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے اختتام اور دوسری دہائی کے آغاز میں پہلے یہ مباحث انگریزی سے ترجمہ ہو کر اردو میں آئے تو اردو ادب کا مطالعہ بھی اس تھیوری کے تحت کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ گوپی چند نارنگ اور ناصر عباس نیر نے اس حوالے سے خاصا کام کیا۔ انہوں نے اردو میں مابعد نو آبادیات اور رد استعمار مطالعات کو بطور تھیوری متعارف کروانے کی بنیاد ڈالی گو کہ اب یہ تھیوری اردو میں معروف ہے اور اس کے تحت کئی کلاسیکی متون کو پرکھا جا چکا ہے۔ نیز اب بھی اس حوالے سے مختلف سطحوں پر تحقیقی و تنقیدی نوعیت کا کام ہو رہا ہے لیکن یہ اب بھی ابتدائی مراحل میں ہے اور اب تک اس حوالے سے زیادہ تر کام جامعات کی سطح پر ہی ہو رہا ہے۔ یہ تھیوری معروف تو ہے لیکن اس کے عملی اطلاق کی مثالیں اب بھی خال خال ہی ہیں۔

حوالہ جات

1۔ ناصر عباس نیرؔ، مابعد نو آبادیات: اُردو کے تناظر میں، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۳ء، ص ا
2۔ محمد عامر سہیل، نو آبادیات، مابعد نو آبادیات اور ردِ استعماریت، کراچی: ماہنامہ قومی زبان، نومبر ۲۰۲۰ء، ص ۹۰
3۔ Fanon, Frantz, The Wretched of the Earth, Grove Press, 2004, P.23
4۔ ناصر عباس نیرؔ، ثقافتی شناخت اور استعماری اجارہ داری، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۴ء، ص ۳۰
5۔ ناصر عباس نیر، ڈاکٹر، مابعد نو آبادیات: اردو تناظر، کراچی: آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص ۴۵
6۔ حنا جمشید (مرتبہ)، عالمگیریت، ثقافت اور ادب، فیصل آباد: مثال پبلشرز، ۲۰۱۹ء، ص ۳۴
7۔ مبارک علی، ڈاکٹر، تاریخ تحقیق کے نئے رجحانات، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۲۰ء، ص ۱۹۰
8۔ محمد حسن عسکری، جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کا خاکہ، کراچی: مکتبہ اسلوب، ص ۷۸
9۔ محمد عامر سہیل، نو آبادیات و مابعد نو آبادیات، لاہور: عکس پبلی کیشنز، ۲۰۱۹ء، ص ۳۱
10۔ محمد صدیق قریشی (مرتب)، کشاف اصطلاحاتِ سیاسیات و عمرانیات، کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف، جامعہ، ۱۹۸۵ء، ص ۲۱۴